باب سوم

فلم

(الف)

اردو کی بقا اور مقبولیت میں فلموں کا کردار

فلم اور اردو کے تعلق کے حوالے سے کی جانے والی باتوں میں بالعموم فلموں کی مقبولیت میں اردو کے کردار کی بات ہی کی جاتی ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں ہے کیوں کہ فلم سازی کے مراحل میں ابتداء سے لے کر اختتام تک مختلف سطحوں پر اردو بڑا موثر کردار ادا کرتی آئی ہے۔ اردو اور فلموں کا تعلق ہندوستان میں فلموں کی ابتداء ہی سے ہے۔ یہ روایت اب پختہ سے پختہ تر ہو کر تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ آج بھی اردو اور فلموں کے مراسم خوشگوار ہونے کی وجہ سے فلم سازی کا عمل سازگار ماحول میں پروان چڑھ رہا ہے اور فلمیں اردو کی چاشنی میں ڈوب کر قبولِ عام پا رہی ہیں۔

فلموں کی مقبولیت میں اردو کے کردار کی بات ہوتی ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے مگر اردو کی بقا، فروغ اور قبولِ عام میں فلموں کے کردار والے پہلو کو بالعموم نہ موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے اور نہ زیرِ مطالعہ لایا جاتا ہے۔ یہاں اس ذیلی باب میں میری کوشش فلم اور اردو کے تعلقات کے اسی پہلو کو موضوعِ گفتگو بنانے کی ہے۔

فلم اور ہندوستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے ایک طبقے کا خیال ہے کہ اگر کسی ایک چیز نے اردو کو زندہ رکھا ہے تو وہ فلمیں ہیں۔ فلم کی حیثیت ایک فن پارے کی سی ہے۔ جس طرح ایک فن پارہ اپنی تخلیق کے بعد عوام کی توجہ کا مرکز بنتا ہے، بیشمار لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں اور وہ چیز آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھی فلم کی یاد اذہان میں باقی رہتی ہے۔ لوگ بار بار ان فلموں کو دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے نغمات سن کر لطف اندوز ہوتے ہیں اور مکالمے دہرا کر خوش ہوتے ہیں۔ 'مغلِ اعظم' اپنی تخلیق کی چار دہائیوں اور 'شعلے' تین دہائیوں کے بعد بھی مقبول ہے۔ 'مغلِ اعظم' کے کردار، اس کے مکالمے، اس کے نغمات اور اس میں پرتھوی راج کپور، دلیپ کمار اور مدھو بالا کی اداکاری میں عوام کی کشش آج بھی برقرار ہے۔ 'شعلے' کو تو گزشتہ الفی کی فلم قرار دیا ہی جا چکا ہے۔ 'مغلِ اعظم' میں فارسی زدہ اردو کے استعمال کے باوجود اس کے نغمات اور مکالمے انتہائی مقبول ہیں۔

لیکن زبان کا معاملہ ذرا بعد کا ہے۔ چوں کہ یہ فلمیں شاہ پاروں کا درجہ پا چکی ہیں اس لئے فلم کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر تشنہ ہی رہے گی۔ اس طور پر ان کا نام رکھنے میں استعمال کیا جانے والا لفظ بھی محتاجِ تعارف نہ ہوگا بلکہ دوسرے سیاق وسباق میں بھی جب ان الفاظ کا استعمال ہوگا تو ذہن میں ایک بار فلم کی یاد ضرور کوندے گی۔ فلموں کے نام رکھنے میں اردو کا استعمال فیاضی کے ساتھ کئے جانے کی وجہ سے فلمیں ان الفاظ اور اس زبان کے تحفظ کی ضامن ہیں جن سے وہ الفاظ لئے گئے ہیں۔ اس طور پر اردو کی بقا کی راہ ہموار کرنے کی ابتداء فلموں میں اولاً ان کے نام رکھنے ہی سے ہوئی۔

فلموں میں اردو کا استعمال فلموں کے نام اردو میں رکھے جانے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ منظر نامے اور نغمات بھی اردو ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ خواہ ہندی کو بھارت کی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا ہو (تاریخ شاہد ہے کہ اس کا فیصلہ ہوتے وقت بھی اردو ہندی کے ہم پلہ تھی مگر صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنے حقِ رائے دہی کا استعمال ہندی کے حق میں کر کے اس کے قومی زبان بننے کی راہ ہموار کی تھی) مگر سرکاری تحفظات کے باوجود ہندی عوام کی پسندیدہ زبان نہیں بن سکی۔ خواندہ اور متمول طبقہ انگریزی میں بات کرتا ہے تو عام لوگ ہندوستانی میں بات کرتے ہیں جس میں اکثریت اردو الفاظ کی ہوتی ہے۔ اور اب چوں کہ تلفظ کی صحت کی جانب بھی بیدار مغزی پائی جانے لگی ہے اس لئے بول چال میں بھی اس کا دھیان رکھا جاتا ہے۔

برقی ذرائع ابلاغ کے نشریوں میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ اردو سے زیادہ قریب ہے(دور درشن اور آل انڈیا ریڈیو کی زبان کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ خالص ہندی استعمال کرنا ان کی مجبوری ہے مگر اس کے باوجود ان کی نشریات میں بھی اردو الفاظ قابلِ لحاظ مقدار میں موجود ہوتے ہیں)۔نجی ٹی وی چینلوں اور نجی ریڈیو اسٹیشنوں پر استعمال کی جانے والی زبان (مثالیں بالترتیب باب چہارم اور باب دوم میں مل جائیں گی) بلا مبالغہ خالصتاً اردو نہیں تو اردو سے قربت تو رکھتی ہی ہے۔ یہ فلموں میں استعمال ہونے والی زبان ہی کا اثر ہے کہ فلموں کی زبان کی عوامی مقبولیت نے دیگر برقی ذرائع ابلاغ کو بھی اسی طرح کی عوام پسند زبان کو اپنی نشریات میں ترجیح دینے پر مجبور کیا۔ یوں اردو کا تحفظ فلموں ہی سے نہیں بلکہ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں کی وجہ سے بھی یقینی ہو گیا۔

کسی بھی زبان کا رسم الخط اس کے وجود کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ رسم الخط سے زبان کی لاتعلقی سے زبان کا حال وہی ہو جاتا ہے جو بغیر پوست کے جسم کا ہو سکتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے اردو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ مگر اردو کو کینہ پرور نگاہوں سے دیکھنے والوں نے اس کو مٹانے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا کہ اردو کی تخلیقات اگر دیوناگری رسم الخط میں بھی دستیاب ہوں تو اس سے اس زبان کے شہ پاروں کی رسائی ان لوگوں تک بھی ہو جائے گی جو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں۔ اس خیال پر کام کرتے ہوئے اردو شاعری کے بڑے سرمائے کو دیوناگری میں منتقل کرنے کا کام ہوا جس سے اردو ادب کا ذوق رکھنے والے ہندی داں حضرات کو اپنی زبان میں اردو سرمایہ دستیاب ہو گیا۔ اس سے یہ تو ہوا کہ اردو ادب سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ وسیع ہوا مگر اس سے اردو سیکھنے والوں کی تعداد پر بھی اثر پڑا۔

مذکورہ خیال میں بظاہر تو کوئی عیب نظر نہیں آتا لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعری اور دیگر ادبی شہ پاروں سے دلچسپی رکھنے والے ہندی داں حضرات کو اگر یہ تمام چیزیں دیوناگری رسم الخط میں مل جائیں گی تو انھیں اردو سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ انگریزی کے حوالے سے کبھی یہ بات نہیں کہی جاتی کہ انگریزی کی ابجد سیکھنے سے بہتر ہے کہ انگریزی کو دیوناگری میں لکھا جائے تا کہ انگریزی نہ جاننے والے ہندی کے حوالے سے انگریزی کی تفہیم کر سکیں۔ بعض ریاستوں سے دانستہ ابتدائی جماعتوں سے اردو کی تعلیم کو ختم کرنے سے جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے وہ اردو رسم الخط ہے۔ اردو بول چال کی زبان ہونے کی وجہ سے گفتگو کی حد تک تو باقی ہے، مشاعروں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے مگر ایک قابلِ لحاظ طبقہ اردو کو بول چال میں استعمال کرنے اور اس کا فہم رکھنے کے باوجود تحریری زبان سے نابلد ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو کسی حد تک اگر اردو پڑھ بھی لیتا ہے تو بھی لکھ نہیں سکتا۔ ایسے ماحول میں بھی فلموں نے اردو رسم الخط کی بقا میں اپنی سی کوشش کی۔

سنیما کے پوسٹروں نے اردو رسم الخط کی بقا کو ضمانت فراہم کی۔ فلموں کے ٹائٹل نے اردو رسم الخط کی شناسائی کو یقینی بنایا۔ آج بھی حالاں کہ بالعموم فلمی پوسٹروں پر فلم کے نام اردو میں نہیں دئے جاتے، یہی حال اب فلمی ٹائٹل کا بھی ہو رہا ہے مگر عرصہء دراز کے بعد سنہ ۲۰۰۴ء میں ریلیز کی گئی فلم 'مقبول' اور 'خاموش پانی' کے پوسٹروں پر فلم کے ٹائٹل اردو میں بھی نظر آئے۔ ۲۰۰۳ء کی کامیاب فلموں میں فلم 'باغبان' کا ٹائٹل اردو میں بھی دیا گیا تھا۔

فلموں کے پوسٹروں پر فلموں کے نام کا اردو میں بھی لکھا ہونا اور فلموں میں ٹائٹل کا ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی ہونا آج ایک غیر اہم سی چیز معلوم ہوسکتا ہے مگر تقسیمِ ہند اور اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان تسلیم کر لئے جانے کے بعد جب کہ مسلمانوں اور اردو کے خلاف محاذ آرائی کی فضا عام تھی ایسے وقت میں فلموں کے پوسٹروں اور ٹائٹلوں کے ذریعہ بھی اردو رسم الخط کا تحفظ قابلِ ذکر امر ہے جس کا سہرا فلموں ہی کے سر بندھتا ہے۔

معاملہ صرف عشق و محبت کے احساسات کے تحفظ کا نہیں تھا بلکہ اردو میں قلم بند کئے گئے حب الوطنی کے جذبات کے تحفظ کا بھی تھا۔ وطنِ عزیز کی محبت میں اردو کے شعراء نے بہت کچھ لکھا مگر وہ چیزیں ایک قابلِ لحاظ خواندہ طبقے کی نظر سے گزریں اور اس سے بھی کم لوگوں کی یادداشت میں باقی ہیں۔ مگر حب الوطنی کو موضوع بنا کر لکھے گئے گیتوں کو فلموں ہی نے تحفظ دیا۔ جب بھی حب الوطنی کے نغمات کی بات کی جاتی ہے تو بے اختیار یادوں کے نہاں خانوں سے نکل کر مندرجہ ذیل نغمات ہونٹوں پہ بکھر جاتے ہیں:

۱۔ کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیوں	اب تمہارے حوالے وطن ساتھیوں
۲۔ اے میرے وطن کے لوگوں	ذرا آنکھ میں بھر لو پانی
جو شہید ہوئے ہیں ان کی	ذرا یاد کرو قربانی
۳۔ اے وطن اے وطن ہم کو تیری قسم	تیری راہوں میں جاں تک لُٹا جائیں گے
۴۔ وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو	پکارتے ہیں یہ زمین و آسماں شہید ہو
۵۔ ہر کرم اپنا کریں گے اے وطن تیرے لئے	دل دیا ہے جاں بھی دیں گے اے وطن تیرے لئے

جس طرح نغمات ہندی فلموں کا جزو لاینفک ہیں اسی طور پر عشق و محبت فلموں کا لازمی حصہ۔ اور ہندی فلموں میں پیار و محبت کے اظہار کے لئے سب سے موثر حربہ نغمات ہیں۔ حکایتِ دل کی تشریح کے لئے جس قدر موزوں الفاظ کا خزانہ اردو ادب میں ہے وہ اپنے آپ میں بے نظیر ہے۔ خالص ہندی میں بھی اظہارِ عشق کی کوشش کی تو گئی ہے مگر وہ خال خال ہی ہے اور بے تکی بھی لگتی ہے۔ ایک نغمے کے بول ملاحظہ کریں، بات واضح ہو جائے گی:

''یدی آپ ہمیں آدیش کریں تو — پریم کا ہم شری گنیش کریں

یا پھر

اک چتر نار کر کے سنگار، مرے من کے دوار یہ گھست جات، ہم مرد جات''

وغیرہ

اس کے برعکس انھیں احساسات کو اگر بعض اردو الفاظ کی مدد سے نثر میں بھی کہیں تو سماعت پر گراں نہیں گزرتا اور مذکورہ مکھڑوں کے مقابلے تو بہتر ہی لگتا ہے۔ جیسے اگر یوں کہیں کہ اگر آپ ناپسند نہ کریں تو حالِ دل بیان کروں، تو بات کم و بیش وہی ہوئی جو پہلے نغمے کے بول میں کہی گئی مگر اردو کے بعض الفاظ کے استعمال سے اندازِ بیان بہتر ہو گیا۔ اور اردو ہی وہ زبان ہے جس

میں فلموں میں دو محبت کرنے والے دل ایک دوسرے کے لئے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

۱۔

نہ دل کیوں دوانا تمہیں دیکھ کر ہو
تمہیں کیا خبر تم حسیں کس قدر ہو
تمنا ہے یہ سلسلہ عمر بھر ہو
تمہاری ہو صورت ہماری نظر ہو۔ [۱]

۲۔

دل کا رشتہ بڑا ہی پیارا ہے
کتنا پاگل یہ دل ہمارا ہے
ہم تو اک دوسرے پہ مرتے ہیں
جانتا یہ جہان سارا ہے۔ [۲]

دو مختلف فلموں سے دو الگ الگ شاعروں کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا۔ یہ اظہارِ محبت کرنے والے نغمات ہیں جن کی ہئیت رباعی کی ہے۔ اظہار محبت کے لئے استعمال کی گئی مذکورہ شاعری کو دیکھئے۔ اگر دل کی جگہ ہردے، خبر کی جگہ سماچار، حسیں کی جگہ سندر، کس قدر کی جگہ کتنی، تمنا کی جگہ اچھا، عمر کی جگہ آیو، صورت کی جگہ مکھ، نظر کی جگہ درشٹی، رشتہ کی جگہ سمبندھ اور جہان کی جگہ وِشو کا استعمال کیا جاتا تو ان نغموں کی کیا درگت بنتی۔ ادبی اور خالص ہندی میں وہ بات آ ہی نہیں پاتی جو نغمے کے بولوں کی تشکیل کے لئے اردو کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ایسی مثالیں ایک دو نہیں ہزاروں ہیں۔ اس طور پر یہ معلوم ہوا کہ اتنی بڑی تعداد میں اردو الفاظ اور اندازِ بیان کی حفاظت کا سامان فلموں کی وجہ سے ہو گیا۔

سنجیدہ اردو شاعری نے تین طور پر فلموں میں جگہ پائی۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس کا جائزہ الگ الگ لینے کی ضرورت ہے۔

اول کلاسیکی اردو شاعری کو فلمی ضرورتوں کے اعتبار سے من وعن فلموں میں استعمال کیا گیا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:
امیر خسرو کا گیت 'کاہے کو بیاہے بدیس' فلم 'امراؤ جان' میں استعمال ہوئی ہے۔ مغل تاجدار اور شاعر بہادر شاہ ظفر کا کلام 'لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں' فلم 'لال قلعہ' میں استعمال کیا گیا۔ 'شمسیر برہنہ' بھی بہادر شاہ ظفر کا ہی کلام ہے جسے فلم 'منڈی' میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ فلم ۱۹۸۳ء میں نمائش کے لئے پیش ہوئی تھی اور ظفر کے کلام کو آواز سے پریتی ساگر نے آراستہ کیا تھا۔ حسرت موہانی کی غزل 'چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے' فلم 'نکاح' میں استعمال ہوئی۔ غلام علی نے اس غزل کو اپنی آواز سے آراستہ کر کے اس کے مداحوں کے حلقے کو بہت وسیع کیا۔ میر تقی میرؔ کا کلام 'دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا' کو فلم 'بازار' میں بطورِ نغمہ

استعمال کیا گیا۔ مرزا غالب کی غزل 'دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے' فلم 'مرزا غالب' میں استعمال کی گئی۔ علامہ اقبال کا کلام 'کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں' فلم 'دلہن اک رات کی' میں استعمال ہوا۔ قلی قطب شاہ کا کلام 'پیا باج پیالہ پیا جائے نا' فلم 'نشانت' کی زینت بنا۔ واجد علی شاہ کا کلام 'بابل مورا نئی ہر چھوٹا جائے' فلم 'استری سنگار' میں لیا گیا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ فلم 'سوراج' میں میر انیس اور جمیل مظہری کے مرثیے شامل کئے گئے ہیں۔ ہدایت کار انور جمال کی یہ فلم ۲۰۰۲ء میں نمائش کے لئے پیش ہوئی اور ۲۰۰۳ء میں اسے بہترین فیچر فلم برائے سماجی مسائل کا قومی اعزاز دیا گیا۔

دوم اردو شعراء نے اپنے شائع شدہ کلام کو فلموں میں استعمال کیا۔ مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

ساحر لدھیانوی فلموں کے لئے لکھنے سے پیشتر بھی معروف ترقی پسند شاعر تھے۔ جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری اور ندا فاضلی وغیرہ بھی اسی گروہ کے ارکان ہیں۔ ساحر کو جب نغمہ نگار کے طور پر کامیابی مل گئی تو انھوں نے اپنی بعض مشہور شعری تخلیقات کو فلموں میں بطورِ نغمہ استعمال کیا۔ ان کے شعری مجموعوں 'تلخیاں' اور 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' کی بعض نظمیں فلموں میں بطورِ نغمہ استعمال ہوئیں۔ 'تلخیاں' کی نظم 'متاعِ غیر' (فلم سونے کی چڑیا میں)، نظم 'چکلے' (فلم پیاسا میں)، اور نظم 'خوبصورت موڑ' (فلم گمراہ میں)، بطورِ نغمہ استعمال ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' کی نظم 'کبھی کبھی' فلم کبھی کبھی میں امیتابھ بچن کی آواز میں ریکارڈ کر کے استعمال کی جا چکی ہے۔ ساحر کے علاوہ شاعر، منظر نامہ نویس اور نغمہ نگار جاوید اختر نے اپنے پہلے اور واحد مجموعہ کلام 'ترکش' سے ایک نظم کو فلم 'Duplicte' میں بطور نغمہ استعمال کیا۔ نظم تھی 'کتھئی آنکھوں والی اک لڑکی ایک ہی بات پہ روز بگڑتی ہے، تم مجھے کیوں نہیں ملے پہلے روز یہ کہہ کر مجھ سے لڑتی ہے'۔ اس کے علاوہ بھی اور مثالیں مل جائیں گی۔ مخدوم محی الدین کی نظم چارہ گر فلم 'چاچا چا' میں بطور نغمہ استعمال ہو کر مقبول ہوئی۔ خواہ عوام یہ نہ جانتے ہوں کہ 'اک چمیلی کے منڈوے تلے' مخدوم کی غیر فلمی تخلیق ہے جسے بعد میں فلم میں بطورِ نغمہ استعمال کیا گیا مگر اس نغمے پر جھومتے ضرور ہیں۔ مخدوم کا ہی کلام 'پھر چھڑی رات بات پھولوں کی' فلم 'بازار' میں استعمال کیا گیا۔ فیض احمد فیض کا کلام 'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' فلم 'قیدی' میں بطور نغمہ استعمال ہوا۔ اسرار الحق مجاز کی نظم 'آوارہ' فلم 'ٹھوکر' میں استعمال ہوئی۔ جاں نثار اختر کا کلام 'آئی زنجیر کی جھنکار خدا خیر کرے' فلم 'رضیہ سلطان' میں استعمال ہوا۔ کیفی اعظمی کا کلام 'ہو کے مجبور مجھے اس نے بھلایا ہوگا' فلم 'حقیقت' میں بطورِ نغمہ استعمال ہوا۔ مجروح سلطانپوری کا کلام 'ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح' فلم 'دستک' میں بطورِ نغمہ استعمال ہوا۔ سردار جعفری کا کلام 'شامِ غم کی قسم' فلم 'فوٹ پاتھ' میں استعمال کیا گیا۔ اس طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ معروف اردو شعراء کے کلام کو عوام کے بڑے طبقے تک پہنچانے، انھیں عمرِ جاودانی عطا کرنے اور ان کے تحفظ کو یقینی بنانے میں فلمیں کس طور پر مددگار ثابت ہوئی ہیں۔

سوم معروف اردو شعراء کے کلام سے مصرعے، ٹکڑے اور شعراء کے حوالے جا بجا ہندی فلمی نغموں میں جگہ پا گئے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

فلم 'اک دوجے کے لئے' کے نغمے 'ہم بنے تم بنے اک دوجے کے لئے' میں نغمے کے بیچ میں مغنیہ گاتی ہے 'عشق پر زور نہیں، غالب نے کہا ہے اسی لئے۔ مومن کا جاوداں شعر 'تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا' فلم 'لو ان شملا' کے نغمے 'اے مرے شاہِ خوباں اے مری جانِ جاناں تم مرے پاس ہوتے ہو کوئی دوسرا نہیں ہوتا' کی شکل میں استعمال ہوا ہے۔ غالب کا مصرعہ 'جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن' فلم 'موسم' میں نغمے کی صورت میں اس طور پر ڈھلا ہے.....

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے۔

فلم 'دل سے' کے نغمے 'تو ہی تو، تو ہی تو ست رنگی رے' کے بیچ میں غالب کا یہ شعر استعمال ہوا ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب جو لگائے نا لگے اور بجھائے نا بنے۔

اردو غزل اپنی ہئیت اور موضوعات سمیت فلمی شاعری کا قلب و جان بن گئی ہے۔ فلمی نغمے نے اردو شاعری کی جس چیز سے سب سے زیادہ استفادہ کیا وہ اردو غزل ہے۔ یہ استفادہ صرف ہئیت تک ہی محدود نہیں بلکہ موضوعات پر بھی بسیط ہے۔

غزل نے فلمی شاعری میں تین اعتبار سے جگہ محفوظ کی۔ پہلے تو یہ ہوا کہ غزل کو بطورِ نغمہ فلموں میں استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد معروف اردو شعراء (غالب، میر، اقبال، فیض وغیرہ) کی غزلیں فلموں میں شامل کی گئیں۔ اور ان چیزوں کا دیرپا اثر یہ ہوا کہ عام طور پر فلمی نغموں کے مکھڑے ردیف اور قافیہ کے التزام کے ساتھ غزل کا مطلع معلوم ہونے لگے۔ بقیہ چیزیں تو وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو گئیں مگر جہاں تک نغموں کے مکھڑے کا غزل کے مطلع سے مشابہ ہونا ہے وہ چیز ہنوز باقی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) آج کہنا ضروری ہے کہ تم سے پیار ہوا ہے بڑی مشکل یہ دوری ہے کہ تم سے پیار ہوا ہے

(فلم: انداز، نغمہ نگار: سمیر، ۲۰۰۳ء)

(۲) تیرے نام ہم نے کیا ہے جیون اپنا سارا صنم پیار بہت کرتے ہیں تم سے عشق ہے تو ہمارا صنم

(فلم: تیرے نام، نغمہ نگار: سمیر، ۲۰۰۳ء)

(۳) تیری باہوں میں ہم جیتے مرتے رہے یوں ہی ہم تم سے پیار کرتے رہے

(فلم: خاکی، نغمہ نگار: سمیر ۲۰۰۴ء)

مذکورہ مثالیں تو موجودہ صورتِ حال کی ہیں۔ غزل سے استفادے کی یہ روایت دہائیوں پرانی ہے۔ مختلف دہائیوں سے کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے بڑی چوٹ کھائی جوانی پہ روئے

(فلم: مغل اعظم، نغمہ نگار: شکیل بدایونی)

(۲) رخ سے ذرا نقاب اٹھا دو مرے حضور — جلوہ پھر اک بار دکھا دو مرے حضور

(فلم مرے حضور، نغمہ نگار: حسرت جے پوری)

(۳) دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے — ہم وفا کر کے بھی تنہا رہ گئے

(فلم: نکاح، نغمہ نگار: حسن کمال)

(۴) دھڑکنیں، سانسیں، جوانی، زندگانی آپ کی — آپ نے چاہا ہمیں یہ مہربانی آپ کی

(فلم: بیٹا، نغمہ نگار: سمیر)

تو اس طور پر معلوم ہوا کہ غزل نے فلمی نغموں پر کیسی امٹ چھاپ چھوڑی ہے کہ نغموں کے ابتدائی بول غزل کا مطلع معلوم ہونے لگے ہیں۔ خود غزل نے بھی بطورِ نغمہ جا بجا فلموں میں جگہ پائی ہے۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح — اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

(فلم: دستک، شاعر: مجروح سلطان پوری)

(۲) تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا — زندگی دھوپ تم گھنا سایہ

(فلم: ساتھ ساتھ، شاعر جاوید اختر)

(۳) ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں — ان آنکھوں سے وابستہ افسانے ہزاروں ہیں

(فلم: امراؤ جان، شاعر: شہریار)

(۴) ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے — عشق کیجے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے

(فلم: سرفروش، شاعر: ندا فاضلی)

(۵) جاگتے جاگتے اک عمر کٹی ہو جیسے — جان باقی ہے مگر سانس رکی ہو جیسے

(فلم: تم بن، شاعر: فیاض انور)

اس طور پر اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف غزل فلموں کا جزوِ لاینفک بن گئی۔ یوں غزلوں کی ہیئت اپنے موضوعات اور اپنی گوناگونیت کے ساتھ فلموں کی شکل میں محفوظ ہو گئی۔ فلموں سے پروان چڑھے غزل کے اسی ذوق نے غزل کو اتنی مقبولیت عطا کی کہ غزل سرائی باقاعدہ پیشہ بن گئی۔ اس پیشے سے وابستہ کچھ معروف نام ہیں: جگجیت سنگھ، پنکج ادھاس، طلعت عزیز اور چندن داس وغیرہ۔

فلموں سے اردو شاعروں کی وابستگی سے ان شعراء کو فکرِ معاش سے آزادی ملی جس سے ان کے تخلیقی سوتے خشک ہونے کے بجائے رواں ہو گئے۔ حال آں کہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کا فائدہ بالعموم فلمی شاعری ہی کو ملا۔ شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر اور جاوید اختر اس کی مثالیں ہیں۔ انھوں نے فلمی شاعری کو نئی وسعتوں سے روشناس کرایا، اردو کی شعری آفاقیت سے نغمات کے دامن کو پُر کر کے اسے ادبی شاعری کے ہم پلہ بنانے کی کوشش کی۔ اگر ۵۰ اور ۶۰ کی دہائیوں کی فلموں کو

بھارتی فلموں کا سنہرا دور کہا جاتا ہے تو اسے سنہرا بنانے میں ان شاعروں نے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

اگر مورخ اس دور کی فلموں کی بات کرتے ہوئے اداکاری، موسیقی اور ہدایت کاری کی بات کرتا ہے تو لازمی طور پر وہ شاعری کی بات بھی کرتا ہے اور شعراء کی خدمات کے اعتراف سے بھی نہیں چوکتا۔ ادیبہ قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک انٹرویو میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ مجروح اور ساحر نے فلمی نغموں کو ادبی حیثیت کی سطح تک پہنچا دیا۔ ۳؎

یہاں اس کا ذکر ضروری ہے کہ فلموں سے مذکورہ اردو شعراء کی وابستگی کے بعد ان شعراء کی توجہ ادبی شاعری سے ہٹ گئی جس کے نتیجے میں یا تو ان کی غیر فلمی تخلیقات کا سلسلہ بند ہو گیا یا اگر جاری بھی رہا تو اس میں پہلی والی بات نہیں رہی۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ بطور شاعر اس جماعت نے فلمی شاعری کے افق پر اردو کا نقش ثبت کر دیا جسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ اس سے شاعری کے شائقین نے استفادہ کیا جس سے اردو خصوصاً اردو شاعری کی پسندیدگی میں کمی واقع نہیں ہوئی اور اس کی آب و تاب برقرار رہی۔

کسی زبان کے ساتھ اس کی لفظیات اور تلفظ کا معاملہ بڑا اہم ہے۔ اردو کے ساتھ اس کی خصوصی اہمیت اس لئے بھی ہے کیوں کہ اردو کے بہت سارے الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں ہندی زبان میں کثرت سے رائج ہیں۔ ایسی حالت میں عوام کو تذبذب کی کیفیت سے بچانے کے لئے یہ بڑا ضروری ہے کہ الفاظ کی ادائیگی درستگی کے ساتھ ہو۔

ایک زمانے میں الفاظ کا صحیح تلفظ سیکھنے کے لئے اساتذہ دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے خبرناموں کو توجہ کے ساتھ سننے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایسا اس لئے تھا کہ اس زمانے میں زبان کی صحت پر بڑا زور دیا جاتا تھا اور خبروں کو پڑھنے کے لئے تلفظ کی صحیح ادائیگی لازمی ہوا کرتی تھی۔ مخلوط زبان کی تہذیب نے زبان کے خالص انداز میں بولنے کی روایت کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اب ٹیلی ویژن کے خبرناموں کی زبان بھی (انگریزی کے خبرنامے اس سے مستثنیٰ ہیں) مخلوط زبان ہو گئی ہے کیوں کہ عوام میں اسی قسم کی زبان رائج ہوتی جا رہی ہے۔

مذکورہ صورتِ حال میں فلموں (بالخصوص نغموں، بالعموم مکالموں) نے اردو زبان کے تلفظ کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ آج اردو سیکھنے کے لئے فلمی نغمے حوالے کے طور پر استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ کوئی لفظ کیسے بولا جاتا ہے، کسی لفظ کا صحیح تلفظ کیا ہے تو فلموں میں (بالخصوص نغموں میں) اس لفظ کے استعمال کو دیکھنے سے اس کا علم ہوتا ہے کہ کوئی مخصوص لفظ کس سیاق میں کیسے استعمال ہوتا ہے اور اس کا درست تلفظ کیا ہے۔ سماج کے دوسرے اداروں کی طرح فلموں میں بھی انحطاط ہوا ہے مگر اس کے باوجود آج بھی فلموں میں بڑی حد تک اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس طور پر دیکھا جائے تو فلمی نغموں اور مکالموں نے اردو کو اس طور پر بھی تحفظ دیا۔

ہندی فلموں میں عدالت کے مناظر خاصے مقبول ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت کئی فلمیں کامیابی سے ہم کنار ہوئیں۔ عدالت میں منصف بالکل انگریز معلوم ہوتا ہے، وکلاء بھی اسی قبیل کے معلوم ہوتے ہیں۔ سارے ماحول سے برطانوی حکومت کے ہنوز باقی رہنے کا گمان گزرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود عدالت میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ اردو ہے۔ عدالت کی

کاروائی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو یہاں سر چڑھ کر بولتی ہے۔ ملزم، مجرم، ثبوت، چشم دید گواہ، قتل، وکیل، انصاف، معصوم، گناہ گار، بیان وغیرہ الفاظ دہائیوں سے عدالتی زبان کا حصہ ہیں۔ پھر منصف جب اپنا فیصلہ سناتا ہے تو کہتا ہے.... دفعہ نمبر، تعزیرات ہند دفعہ .... کے تحت، اور پھر سزا، عمر قید یا سزائے موت۔ اور اگر ملزم بے قصور ہے تو باعزت بری ہو جاتا ہے۔ یعنی فلموں میں عدالتی مناظر کی عکس بندی کے لئے جو زبان استعمال ہوتی آئی ہے وہ اردو ہے۔ اور عدالت میں جرح، دلیل، شواہد، مباحث اور فیصلوں سے متعلق لفظیات اردو کے ہی خزانے سے مستعار لی جاتی رہی ہیں۔ اس طور پر سات دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے پر محیط بولتی فلموں کی تاریخ میں عدالت کے مناظر میں استعمال ہونے کی وجہ سے مذکورہ لفظیات محفوظ ہوگئی ہیں۔ یہاں ایک اہم چیز کی جانب اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بی آر چوپڑا کی فلم 'قانون' ایسی پہلی فلم ہے جس کا بیشتر حصہ عدالتی مناظر پر مبنی ہے۔ اس فلم کی کامیابی نے فلموں میں عدالتی مناظر رکھے جانے کی راہ ہموار کی۔ عدالتی مناظر والی دیگر قابلِ ذکر فلموں میں 'وقت' اور 'میرا سایہ' بھی ہیں۔ ان تینوں فلموں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان فلموں کی کہانیاں اور منظرنامے معروف ادیب اختر الایمان نے تحریر کئے تھے۔

اردو صرف عدلیہ اور انتظامیہ ہی کی نہیں عوام کی بھی زبان ہے۔ اسی زبان میں عام انسان بات کرتا ہے اور دکان دار، سبزی والا، مکان مالک، کرائے دار، کاری گر، باورچی، صاحب، شادی، بربادی، بخار، علاج، دوا، دارو، کاروبار، دفتر، کچہری اور ناشتہ وغیرہ جیسے نہ جانے کتنے الفاظ ہر وقت استعمال کرتا ہے۔ اگر اردو روزمرہ کی زبان میں اتنی زیادہ رچ بس گئی ہے تو فلمیں اس سے اچھوتی کیسے رہ سکتی ہیں۔ فلمیں بھارتی عوام کے ایک بڑے طبقے کی تفریح کا واحد اور سستہ ذریعہ ہیں۔ تکنیکی انقلاب کی وجہ سے فلموں کے تحفظ کے ساتھ فلموں میں استعمال ہونے والی زبان کا تحفظ بھی یقینی ہوگیا۔ اس چیز نے اس زمانے میں اردو کی بڑی مدد کی جب زندگی کے دوسرے شعبوں سے اسے نکال دیا گیا۔

اس کو اگر آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ لوگ اردو اس لئے پڑھنا نہیں چاہتے کہ اردو روزگار سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ اس لئے ایسی زبان پڑھنے سے فائدہ کیا جس سے کوئی مالی منفعت حاصل نہ ہو۔ جو لوگ شاعری کا ذوق رکھتے ہیں وہ مشکل الفاظ کے معنی کسی سے پوچھ کر شاعری سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی ریاستوں میں اردو ابتدائی جماعتوں سے ہٹا دی گئی ہے جس کی وجہ سے اردو رسم الخط سے بے گانگی پیدا ہوگئی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں بھی آج کے دور میں فلموں سے اردو کو بڑا تحفظ مل رہا ہے۔

اس مرحلے پر ذہن میں اس سوال کا کوندنا لازمی ہے کہ آخر اردو ہی فلموں کی زبان کیوں قرار پائی۔ ہندی فلموں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی جڑیں پارسی تھیٹر میں ہیں جس کی زبان اردو تھی۔ فلموں کے آنے سے تھیٹر سے وابستہ لوگ رفتہ رفتہ فلم سازی کی طرف مائل ہوئے اور اپنے ساتھ اس زبان کو بھی لائے جو اس وقت عوام کی بول چال کی زبان تھی۔ اردو وہ زبان تھی جس میں شہری متوسط طبقہ بات کرتا تھا۔ اس طبقے کے بڑے حصے تک رسائی کے لئے پہلے تھیٹر میں یہ زبان استعمال کی گئی اور وہاں کی کامیابی کے مدِ نظر بعد میں فلموں میں یہی زبان استعمال ہونے لگی۔

برطانوی حکومت میں اردو شمالی ہند میں انتظامیہ کی زبان بنی۔ پہلے یہی مقام فارسی کو حاصل تھا۔ فوج، عدلیہ اور انتظامیہ کی زبان اردو تھی۔ انتظامی زبان ہونے کی وجہ سے سرکاری کام کاج اسی زبان میں ہونے لگے اور عوام تک سرکاری فیصلے اسی زبان میں پہنچنے لگے۔ جب عیسائی مبلغ یہاں آئے تو انھوں نے سب سے پہلے بائبل کا ترجمہ اردو میں کیا۔ ہندی میں بائبل بہت بعد میں آئی۔ عوام میں بول چال کی زبان کے طور پر اردو کے ابھرنے کے چند اسباب تھے۔ سنیما بھلا عوام تک رسائی کے لئے ان سے کیسے پہلو تہی کر سکتا تھا۔ اسی لئے سنیما نے بھی اسی زبان کو اپنایا۔

فلموں نے اردو زبان و ادب کے ساتھ اردو تہذیب کو تحفظ عطا کرنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ فلمیں ایسا تاریخی دستاویز ہیں جن کے مطالعے اور تجزیے سے مختلف ادوار میں اردو کی حیثیت کا پتہ چل سکتا ہے۔ اردو زبان و ادب پر تحقیق کا کام کرنے والوں کے لئے بھی فلمیں اچھا مواد ثابت ہو سکتی ہیں۔